IQBAL REVIEW (67: 3)
(July – September 2026)
ISSN(p): 0021-0773
ISSN(e): 3006-9130

اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں فلسفۂ تقدیر: فرد، ملت اور تخلیقی عمل کا فکری مطالعہ

The Philosophy of Destiny in Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi:
A Study of the Individual, the Community, and Creative Action

فوزیہ
پی ایچ ڈی سکالر
امپریل یونیورسٹی، لاہور

ABSTRACT

This research examines the philosophy of destiny in Allama Muhammad Iqbal's Persian masnavis Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi, with particular reference to the relationship between the individual, the community, selfhood, selflessness, moral action, and collective renewal. The study argues that Iqbal rejects the conventional fatalistic interpretation of destiny as a fixed, external, and unchangeable decree that reduces human beings and communities to passive subjects of predetermined circumstances. Instead, he presents destiny as a dynamic, creative, and evolutionary process shaped through faith, self-awareness, disciplined will, love, moral responsibility, and continuous action. In Asrar-i-Khudi, Iqbal emphasizes the formation and strengthening of the individual self.

Through the stages of obedience, self-control, and divine vicegerency, the individual develops the moral and spiritual capacity required to transform latent possibilities into active realities. Selfhood, therefore, is not egoism or pride, but a conscious, responsible, and God-oriented personality capable of participating in the formation of its own destiny. In Rumuz-i-Bekhudi, this individual self is integrated into the collective life of the Muslim community. Iqbal demonstrates that personal fulfilment cannot be achieved in isolation, and that the destiny of a nation depends upon unity, discipline, sacrifice, justice, equality, brotherhood, and commitment to the principles of Tawhid and Prophethood. The research further clarifies that Iqbal's concept of selflessness does not imply the extinction of individuality; rather, it signifies the strengthening of the self through its attachment to a higher moral and collective purpose. His criticism of passive mysticism is directed not against authentic spirituality, but against interpretations that weaken human agency, courage, and social responsibility. The study also considers Iqbal's lectures, letters, and prose writings as complementary sources that confirm the intellectual continuity of his philosophy of destiny. It concludes that Asrar-i-Khudi and Rumuz-i-Bekhudi present an integrated vision in which individual development and collective organization become two interdependent stages of destiny-making. Iqbal thus transforms destiny from a doctrine of helplessness into a philosophy of conscious action, ethical freedom, spiritual development, and civilizational reconstruction.

Keywords: Allama Muhammad Iqbal; Asrar-i-Khudi; Rumuz-i-Bekhudi; Destiny; Selfhood; Selflessness; Individual and Community; Moral Action; Collective Consciousness; Civilizational Reconstruction.

علامہ محمد اقبال کے فکری نظام میں تقدیر کا تصور ایک ایسے جامع اور حرکی اصول کی حیثیت رکھتا ہے جو فرد کی باطنی تعمیر، ملت کی اجتماعی تنظیم اور انسانی تاریخ کے تخلیقی ارتقا کو باہم مربوط کرتا ہے۔ اقبال نے اسرارِ خودی میں فرد کو اپنی پوشیدہ صلاحیتوں، قوتِ ارادی، عشق، اخلاقی تربیت اور مسلسل عمل کے ذریعے خودی کو مستحکم کرنے اور اپنی تقدیر کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرنے کی دعوت دی، جب کہ رموزِ بے خودی میں اسی انفرادی خودی کو ملت، توحید، رسالت، شریعت، اجتماعی نظم اور تہذیبی ذمہ داری کے وسیع تر دائرے سے وابستہ کر دیا۔ یوں یہ دونوں مثنویاں اقبال کے تصورِ تقدیر کے دو باہم تکمیلی پہلو پیش کرتی ہیں: پہلے مرحلے میں فرد اپنی ذات کو اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کے مراحل سے گزار کر ایک باوقار اور صاحبِ عمل شخصیت بناتا ہے، اور دوسرے مرحلے میں یہی شخصیت ملت کے اجتماعی وجود میں شامل ہو کر قومی و تہذیبی تقدیر کی تعمیر میں حصہ لیتی ہے۔ اقبال کے نزدیک تقدیر کوئی جامد، ازلی اور انسان پر خارج سے مسلط فیصلہ نہیں بلکہ خودی کی بیداری، عشق کی حرارت، ایمان کی قوت، شعوری انتخاب اور منظم جدوجہد سے مسلسل صورت پذیر ہونے والا ایک ارتقائی عمل ہے۔ اسی لیے انھوں نے ایسے صوفیانہ، فلسفیانہ اور تہذیبی رجحانات پر تنقید کی جو انسان کو بے عملی، جبر، تقلید اور انفعال کی طرف لے جاتے تھے، اور اس کے برعکس ایک ایسے تصورِ حیات کو فروغ دیا جس میں فرد اور ملت دونوں اپنی اخلاقی و عملی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ اقبال کے خطبات، خطوط اور نثری بیانات بھی اسی تصور کی تشریح کرتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ تقدیر، خودی، اختیار، علم، اجتہاد اور اجتماعی عمل ایک ہی مربوط فکری نظام کے اجزا ہیں۔ زیرِ نظر تحقیق میں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں فلسفۂ تقدیر کی انفرادی، اجتماعی، روحانی، اخلاقی اور تہذیبی جہات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اقبال نے تقدیر کے روایتی جبری مفہوم کو کس طرح انسان اور ملت کی شعوری، تخلیقی اور تاریخ ساز جدوجہد کے نظریے میں تبدیل کر دیا۔

مثنوی ”اسرار خودی“ اور ”رموز بے خودی“ میں تقدیر کا فلسفہ:

اسرار خودی میں تقدیر کا فلسفہ:

اقبال کی فکری تشکیل میں اسرارِ خودی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، کیونکہ یہی وہ تصنیف ہے جس نے ان کے فکر و فن کا رخ متعین کیا اور انسان، خودی اور تقدیر کے باہمی تعلق کو ایک نئے انداز میں

واضح کیا۔ اقبال نے اس مثنوی میں فرد کی باطنی قوتوں کو بیدار کرنے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر زور دیا ہے، جس سے یہ تصور ابھرتا ہے کہ تقدیر کوئی جامد اور ازلی فیصلہ نہیں بلکہ ایک متحرک حقیقت ہے جسے انسان اپنی خودی کی مضبوطی، عمل اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے سنوارتا ہے۔ اس لحاظ سے اسرارِ خودی اقبال کے تصورِ تقدیر کی ابتدائی اور بنیادی تعبیر پیش کرتی ہے، جہاں انسان کو اپنی تقدیر کا معمار اور اپنے مستقبل کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اقبال نے اسرارِ خودی میں مولانا روم کو اپنا مرشدِ معنوی قرار دے کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے تصورِ تقدیر کی جڑیں اسلامی تصوف اور رومی کی تعلیمات میں پیوست ہیں۔ رومی کی مثنوی سے اثر پذیری نے اقبال کی فکر کو یہ جہت دی کہ انسان اپنی روحانی اور اخلاقی تربیت کے ذریعے تقدیر کے اسرار کو سمجھ سکتا ہے اور اپنی زندگی کو بامقصد بنا سکتا ہے۔ یوں اقبال کے نزدیک تقدیر محض خارجی قوت نہیں بلکہ انسان کی خودی، ارادے اور عمل سے وابستہ ایک زندہ اور ارتقائی عمل ہے، جس کی بنیاد ایمان، عشق اور مسلسل جدوجہد پر قائم ہے:

باز بر خوانم ز فیضِ پیر روم
دفترِ سر بستہ اسرار علوم
جان او از شعلہ ہاسرمایہ دار
من فروغ یک نفس مثل شرار

شمع سوزاں تاخت بر پروانہ ام
بادہ شبخوں ریخت بر پیمانہ ام
پیر رومی خاک را اکسیر کردہ
ز غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد
بر گرفتم پردہ از راز خودی
وز نمودم سر اعجاز خودی[۱]

ان اشعار میں اقبال یہ واضح کرتے ہیں کہ انسان کی تقدیر محض ایک طے شدہ اور جامد حقیقت نہیں، بلکہ روحانی تربیت، رہنمائی اور خودی کی بیداری سے بدلنے اور سنورنے والی حقیقت ہے۔ مولانا روم کے فیض کو وہ اس قوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے اسے

اپنی تقدیر کا شعوری معمار بناتی ہے۔ گویا اقبال کے نزدیک تقدیر کا راز اسی وقت کھلتا ہے جب انسان اپنی خودی کو پہچان کر اسے عمل اور تربیت کے ذریعے مضبوط بناتا ہے۔ پوری مثنوی کم و بیش ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے جسے اقبال نے فلسفہ خودی کو اجاگر کرنے کی غرض سے کئی عنوانات کے تحت تقسیم کر دیا ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہان ست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آروزست[۲]

یہ حکایت دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اقبال کے نزدیک دنیا میں بظاہر انسانوں کی کمی نہیں، مگر حقیقی انسان جو شعور، جرات، عمل اور بلند ارادے کا حامل ہو نایاب ہو چکا ہے۔ ایسے افراد جو اپنی کمزوریوں، جمود اور بے عملی کا شکار ہوں، وہ اپنی تقدیر کو بدلنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، کیونکہ تقدیر کا حقیقی مفہوم محض حالات کے آگے سر جھکا دینا نہیں بلکہ اپنی قوتِ ارادہ اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے ناممکن کو ممکن بنا دینا ہے۔ اسی لیے شیخ کی زبان سے ایسے انسان کی تلاش کا ذکر کیا گیا ہے جس میں شیر خدا اور رستم جیسی شجاعت اور عزم موجود ہو، کیونکہ یہی صفات انسان کو اپنی تقدیر کا معمار بناتی ہیں۔ اسرارِ خودی کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے کہ ایسا باکردار اور فعال انسان پیدا کیا جائے جو اپنی خودی کو پہچان کر اسے عمل، ہمت اور جدوجہد سے مضبوط کرے۔ اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق حقیقی انسان وہ ہے جو حالات کا غلام نہیں بنتا بلکہ اپنے ارادے، ایمان اور مسلسل کوشش کے ذریعے اپنی اور اپنی قوم کی تقدیر سنوارنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح اس حکایت میں تقدیر کو ایک متحرک اور ارتقائی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس کی تکمیل بلند حوصلہ، خود اعتمادی اور عملی جدوجہد سے ممکن ہوتی ہے

اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق خودی کی استواری اور انسان کی تقدیر کی تعمیر کے لیے محض ذاتی کوشش کافی نہیں ہوتی بلکہ راہ محبت میں ایک مرشدِ کامل کی رہنمائی بھی ضروری ہوتی ہے جو اُسوۂ رسولؐ

کا پابند اور مقامِ مصطفیؐ کا شناسا ہو۔ اقبال کے نزدیک آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور آپؐ کا لایا ہوا دین ہی وہ مستقل ہدایت اور بشارت ہے جو انسان کو اپنی صلاحیتوں کو درست سمت میں استعمال کرنے اور اپنی تقدیر کو سنوارنے کا شعور عطا کرتی ہے۔ یوں تقدیر کا حقیقی مفہوم رسولِ اکرم ﷺ کی تعلیمات کی پیروی میں پوشیدہ ہے، جو انسان کو عمل، ایمان اور اخلاق کے ذریعے کامیابی کی راہ دکھاتی ہے:

کیمیا پیدا کن از مشت گلے
بوسہ زن بر آستان کاملے
دل ز عشق او توانا می شود!
خاک ہمدوش ثریا می شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دل مسلم مقام مصطفی است
آبروئے ما زنام مصطفی است [۳]

اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق خودی کی کمزوری اور غلامانہ رویے انسان کو اپنی تقدیر سے محروم کر دیتے ہیں، کیوں کہ ذاتی حرص و ہوس یا بے مقصد سوال اور انحصار خودی کو زوال کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب انسان کسی اعلیٰ مقصد کی محبت سے سرشار ہو کر جرات، خود اعتمادی اور عمل کو اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی تقدیر کو سنوارنے اور دنیا میں قیادت و غلبہ حاصل کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ گوسفندوں اور شیروں کی حکایت کے ذریعے اقبال یہ واضح کرتے ہیں کہ بزدلی، بے عملی اور خوف کو قبول کر لینا دراصل اپنی تقدیر کو کمزور کرنا ہے، جبکہ قوتِ ارادی، جرات اور فعال کردار ہی انسان کو مضبوط تقدیر اور باوقار زندگی کی طرف لے جاتے ہیں:

شیر بیدار از فسون میش خفت
انحطاط خویش را تہذیب گفت [۴]

اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق انسان کی تقدیر کوئی جامد امر نہیں بلکہ خودی کی تربیت سے ارتقائی طور پر تشکیل پاتی ہے۔ اس تربیتی عمل کے تین مراحل ہیں: اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت۔ اطاعت سے مراد شریعتِ الٰہی کی پابندی اور فرائض کی ادائیگی ہے، جو انسان کی زندگی کو نظم اور مقصد

عطا کرتی ہے۔ ضبطِ نفس وہ مرحلہ ہے جس میں انسان اپنی خواہشات اور جذبات کو اعتدال میں رکھ کر نفس کی سرکشی پر قابو پاتا ہے۔ جب انسان ان دونوں مراحل سے کامیابی سے گزر جاتا ہے تو اس کی خودی بلند ہو کر نیابتِ الٰہی کے مقام تک پہنچتی ہے، جو اقبال کے نزدیک انسان کی اصل تقدیر اور تخلیق کا اعلیٰ مقصد ہے۔ یوں تقدیر انسان کے اندر موجود صلاحیتوں کی تکمیل اور روحانی بلندی کا نام بن جاتی ہے، جو مسلسل جدوجہد اور خودی کی مضبوطی سے حاصل ہوتی ہے:

نائب حق درجہان بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است [۵]

اقبال کی اسرارِ خودی کی ابتدائی اشاعت پر مختلف فکری حلقوں میں شدید ردِ عمل سامنے آیا، خاص طور پر اس لیے کہ اقبال نے روایتی تصوف اور بے مقصد شاعری پر تنقید کی اور حافظ شیرازی کے بعض افکار کو بھی علامتی طور پر ہدف بنایا۔ اس اختلاف کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اقبال نے انسان کی تقدیر کو جمود اور محض تقدیر پرستی کے بجائے عمل، خودی اور جدوجہد سے وابستہ قرار دیا، جبکہ بعض صوفیانہ حلقے اسے اپنے نظریات کے خلاف سمجھتے تھے۔ اسی فکری کشمکش کے نتیجے میں تنقیدات اور جوابی تحریریں سامنے آئیں، حتیٰ کہ بعض اہلِ علم نے اقبال کو تصوف کا مخالف قرار دیا۔ بعد ازاں اقبال نے اس فکری الجھن کے پیشِ نظر دوسری اشاعت میں بعض متنازعہ اشعار اور وضاحتیں حذف کر دیں۔ اس واقعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقبال کا تصورِ تقدیر جامد روایت کے بجائے ایک متحرک، عملی اور خودی پر مبنی نظریہ تھا، جو انسان کو اپنی تقدیر کا فعال معمار بننے کی دعوت دیتا ہے:

حافظ جادو بیان شیرازی است
عرفی آتش زباں شیرازی است
بے نیاز از محفل حافظ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر [۶]

حافظ شیرازی چونکہ صوفیانہ حلقوں خصوصاً وحدت الوجود کے پیروکاروں میں مرشد کا درجہ رکھتے تھے، اس لیے اقبال کی ان پر تنقید کو اُس دور میں عمومی طور پر پسند نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اقبال اپنے تصورِ تقدیر میں انسان کی خودی، عمل اور جدوجہد کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں، جبکہ روایتی صوفیانہ فکر میں تقدیر کے جبر اور وجدانی کیفیت کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اس فکری اختلاف کے باعث

اقبال کا اندازِ تنقید متنازع بنا، تاہم بعض محققین کے مطابق یہ اختلاف دراصل تقدیر کے جامد تصور کے بجائے اس کے متحرک اور عملی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش تھی:

> ان اشعار پر زاہدان خشک بہت برہم ہوئے اور کفر کے فتوے لگا دیے اقبال صلح پسند طبیعت رکھتے تھے انھوں نے رفع شر کے لیے اسرار خودی میں سے یہ اشعار خارج کر دیے۔ لیکن اصل میں ان اشعار سے نہ خواجہ حافظ کی ذات پر چوٹ پڑتی ہے نہ سچے تصوف پر کوئی ضرب۔ بلکہ بقول محیط طباطبائی ایرانی اقبال نے در "عرفان سست اور تصوف راکد و جامد کے ساتھ ساتھ، کلام حافظ کی تعلیم اور اس کے اثر پر انتقاد کیا ہے؟[7]

اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی اور دیگر ناقدین نے اقبال کے خلاف سخت مضامین لکھے، تاہم اقبال نے مدلل انداز میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔ اکبر الہ آبادی کے ساتھ خط و کتابت کے ذریعے بھی یہ فکری ابہام دور ہوا اور خودی کے فلسفے کے بعض پیچیدہ پہلو نثر میں زیادہ واضح ہو گئے۔ اقبال نے وضاحت کی کہ ان کی تنقید اسلامی تصوف یا صوفیا کی ذات پر نہیں بلکہ اس طرزِ فکر پر ہے جو انسان میں عمل، جدوجہد اور قوتِ ارادی کو کمزور کر کے اسے جبرِ تقدیر کا قائل بنا دیتا ہے۔ ان کے نزدیک حقیقی تقدیر وہی ہے جو خودی کی بیداری اور مسلسل عمل کے ذریعے انسان کو اپنی زندگی کا فعال معمار بننے کا شعور عطا کرے:

> میں نے خواجہ حافظ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کے دیوان سے میکشی بڑھ گئی ہے۔ میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک لٹریری تنقید تھی۔ خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا، نہ اُن کی شخصیت سے د۔ نہ ان اشعار میں، مئے سے مراد وہ لیے ہیں جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں۔ بلکہ اس سے وہ حالت سکر مراد ہے جو حافظ کے کلام سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ حافظ، ولی و عارف تصور کیے گئے ہیں اس لیے ان کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل ہی نظر انداز کر دی ہے اور میرے ریمارک تصوف و ولایت پر حملہ کرنے کے مترادف سمجھے گئے۔[8]

اقبال کی تصوف اور شریعت سے متعلق وضاحتوں نے ان کے فلسفۂ حیات اور خصوصاً تصورِ تقدیر کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان توضیحات کے بعد ان کے ناقدین کے کئی ابہامات دور ہوئے اور وہ اقبال کے نقطۂ نظر سے کافی حد تک متفق ہو گئے۔ اسرارِ خودی کے حوالے سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں وہ بھی دور ہو گئیں، کیونکہ اقبال کے مطابق تقدیر کوئی جبر نہیں بلکہ خودی، عمل اور جدوجہد سے تشکیل

پانے والا ارتقائی عمل ہے۔ بعد ازاں ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری اور مولانا اسلم جیراج پوری جیسے اہلِ علم نے علمی مقالات کے ذریعے اقبال کے تصورِ خودی و تقدیر کی مزید وضاحت کی، جس سے ان کے فکر کی اصل روح واضح ہو گئی:

فرق یہ ہے کہ غالب کے سلسلے میں مقالہ اردو میں تھا۔ اقبال سے متعلق انھوں نے انگریزی میں لکھا اور رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ (East and West) میں شائع کرایا۔ اُردو کے ممتاز محقق و ادیب مالک رام نے اسے بعد کو اردو میں نقل کیا اور ان کا ترجمہ نیرنگ خیال، لاہور، اقبال نمبر کے ذریعہ منظر عام پر آیا۔[9]

اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد اس پر اعتراضات اس لیے سامنے آئے کہ انھوں نے تصوف کے بعض روایتی تصورات پر تنقید کرتے ہوئے افلاطون اور حافظ شیرازی کے حوالے سے علامتی انداز اختیار کیا۔ تقدیر کے فلسفے کے مطابق اقبال کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ انسان کی تقدیر جبر یا تقلید سے نہیں بلکہ خودی، عمل اور جدوجہد سے تشکیل پاتی ہے، اور یہی ان کے فکر کی اصل بنیاد ہے۔ اسرارِ خودی کو عالمی سطح پر بھی پذیرائی ملی اور پروفیسر اے آر نکلسن کے انگریزی منظوم ترجمے The Secret of Life کے ذریعے مغربی دنیا میں اقبال کے افکار متعارف ہوئے۔ مختلف مغربی ناقدین کے اعتراضات کے جواب میں اقبال نے اپنے خطوط میں یہ وضاحت کی کہ ان کا پیغام کسی فرقہ واریت کا نہیں بلکہ انسان کی عملی قوت، خودی اور تقدیر کی تشکیل میں اس کے فعال کردار پر مبنی ہے۔ اس طرح تقدیر کا اقبال کا تصور ایک عالمگیر، متحرک اور اصلاحی فکر کے طور پر نمایاں ہوا بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ:

ولایت کی تحسین و اعتراف کے بعد ہندوستان کے مغرب پسندوں کے لیے فکر اقبال پہلے سے کچھ زیادہ جاذب توجہ ہونے لگی۔[10]

اسرار خودی میں چونکہ اقبال کا مخاطب

خاص طور پر مسلمانوں سے اور عام طور پر انسانیت سے تھا اس لیے مغرب کے بعض مبصرین مثلاً کیمبرج کے پروفیسر ڈکنسن اور دوسروں نے اپنے تبصروں میں اقبال پر فرقہ پرستی اور نطشے کی تقلید کا الزام لگایا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے پروفیسر نکلسن کو ایک طویل خط میں لکھا:

یہ معلوم کر کے پہلے حد حیرت ہوئی کہ اسرار خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبول عام حاصل کر رہا ہے۔ بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ سے جو میرے اور نطشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکہ کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا نہ اُس کی

کتابیں میری نظر سے گزری تھیں۔ انگریزوں کو چاہیے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لیے جرمن مفکر کے بجائے اپنے ہم وطن فلسفی کے افکار کو رہنما بنائیں۔ میری مراد الیگزنڈر سے ہے جس کے گلاسگو والے خطبے پچھلے سال شائع ہو چکے ہیں۔ میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خون ریزی کا درس دیتا ہے۔ میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں بلکہ میری قوت طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید، ذات پات، رتبہ ودرجہ اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے بارے میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لزاند کے ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع ایسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔[11]

رموزِ بے خودی میں تقدیر کا فلسفہ:

رموزِ بے خودی دراصل اسرارِ خودی کا فکری تسلسل اور تکملہ ہے، جس میں محمد اقبال نے انفرادی خودی کی تکمیل کے بعد اجتماعی خودی اور ملت کی تقدیر کے اصولوں کو نہایت جامع انداز میں بیان کیا ہے۔ اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق انسان اور قوم کی تقدیر کوئی جامد، غیر متبدل اور پہلے سے لکھی ہوئی حقیقت نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک عمل ہے جو شعور، عمل، نظم و ضبط اور باہمی تعاون کے ذریعے مسلسل تشکیل پاتا رہتا ہے۔ اس مثنوی میں اقبال اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ جس طرح فرد اپنی خودی کی تعمیر کے ذریعے بلندی اور کمال تک پہنچ سکتا ہے، اسی طرح ملت بھی اپنی اجتماعی خودی کی مضبوطی، اتحاد، مساوات اور اخلاقی اقدار کے فروغ کے ذریعے اپنی تقدیر کو سنوار سکتی ہے۔ اقبال کے نزدیک فرد کی کامیابی اور اس کی تقدیر کی تکمیل کسی تنہائی میں ممکن نہیں بلکہ اس کے لیے ایک صالح، باشعور اور منظم معاشرے کی ضرورت ہوتی ہے جو فرد کی صلاحیتوں کو ابھرنے اور ترقی کرنے کا موقع فراہم کرے۔ اسی تناظر میں اقبال مغربی قومیت کے محدود اور نسلی تصور پر تنقید کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کو ایک ایسی عالمگیر جماعت قرار دیتے ہیں جو رنگ و نسل، طبقہ اور جغرافیائی حدود کی تنگیوں سے بالاتر ہو کر عدل، مساوات، آزادی اور اخوت کے اصولوں پر قائم ہے۔ یوں رموزِ بے خودی میں تقدیر کا فلسفہ دراصل فرد اور ملت کے باہمی تعلق، اجتماعی نظم و اتحاد، اور ایک ایسے عادلانہ سماجی نظام کے قیام

سے وابستہ نظر آتا ہے جس کے ذریعے قوم نہ صرف اپنی بقا کو یقینی بناتی ہے بلکہ تاریخ میں اپنی فعال اور باوقار تقدیر خود تشکیل دیتی ہے۔ڈاکٹر عابد حسین کے مطابق:

> فرد اور ملک کے ربط کے قانون کو اقبال "بے خودی" کہتے ہیں۔ان کے نزدیک قطرے کے دریا میں مل جانے سے اس کی ہستی فنا نہیں ہوتی بلکہ اور استحکام حاصل کر لیتی ہے، وہ بلند اور دائمی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے۔جس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی قوتیں منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں اور اس کی خودی پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے؟[۱۲]

رموزِ بے خودی پہلی بار ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئی اور اس کا اسرارِ خودی سے گہرا معنوی تعلق ہے۔ علامہ اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق یہ دونوں مثنویاں دراصل ایک ہی فکری منصوبے کی دو کڑیاں ہیں، جن میں پہلے فرد کی خودی کی تعمیر اور پھر ملت کی اجتماعی تنظیم کو تقدیر کی تشکیل کے بنیادی مراحل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اقبال کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دونوں مثنویوں کو ایک ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک فرد اور ملت کی ترقی ایک مسلسل جدوجہد کا حصہ ہے، جس کے ذریعے انسان اور قوم اپنی تقدیر کو خود سنوار سکتے ہیں۔علامہ اقبال نے اسرار خودی کے بارے میں لکھا ہے:

> اگر مجھے فرصت ہوتی تو غالباً اس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔اس کا دوسرا حصہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اس سے زیادہ لطیف ہو گا، کم از کم مطالب کے اعتبار سے گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہو گا۔یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔[۱۳]

رموزِ بے خودی بھی اسرارِ خودی کی بحر میں لکھی گئی ہے اور اس کی تخلیق و تکمیل میں علامہ اقبال کو کئی سال صرف کرنا پڑے، جو اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس فکر کو ایک تدریجی اور سنجیدہ فکری منصوبے کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے۔اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق ملت کی زندگی اور اس کا عروج وزوال محض حادثاتی نہیں بلکہ اس کے اخلاقی، فکری اور عملی رویوں کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی لیے اس مثنوی کے ابتدائی دیباچے میں انھوں نے ملتِ اسلامیہ کے انحطاط کو دور کرنے اور اس کی زندگی کو مستحکم بنانے کے عملی اصولوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔بعد کی اشاعتوں میں اگرچہ یہ دیباچہ شامل نہیں رہا، لیکن اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال اپنی دونوں مثنویوں کی مزید تشریح کے ذریعے یہ بتانا چاہتے تھے کہ قوم کی تقدیر اس وقت سنورتی ہے جب وہ نظم و اتحاد، خودی کی مضبوطی اور اجتماعی ذمہ

داری کے اصولوں کو اختیار کرے۔ یوں رموزِ بے خودی میں تقدیر کا فلسفہ ملت کی اصلاح، استحکام اور مسلسل جدوجہد کے عملی راستوں سے وابستہ نظر آتا ہے، جس کے ذریعے قوم اپنے زوال کو عروج میں بدل سکتی ہے:

> اصول کیا ہے ؟ اس سوال کا جواب مثنوی کے دونوں حصوں میں آچکا ہے مگر مفصل جواب کے لیے ناظرین کو انتظار کرنا چاہیے۔ اگر وقت نے مساعدت کی تو اس مثنوی کا تیسرا حصہ، اس سوال کا تفصیلی جواب ہو گا۔[۱۴]

دو مثنویاں، یعنی اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی ابتدائی اشاعتوں کے بعد اپنے گہرے معنوی ربط کے باعث "اسرار و رموز" کے نام سے یکجا شائع ہونے لگیں اور آج بھی اسی صورت میں دستیاب ہیں، جو اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک فرد اور ملت کی تعمیر دراصل تقدیر کے ایک ہی مربوط فکری نظام کے دو لازمی مراحل ہیں۔ تحقیق کے مطابق مولانا غلام رسول مہر نے ان مثنویوں کی اولین اشاعتوں کے متن کا تقابلی و تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اقبال نے بعد کی اشاعتوں میں متعدد مقامات پر ترمیم و اصلاح کر کے اپنے افکار کو زیادہ نکھارنے اور مؤثر بنانے کی کوشش کی، جو ان کے تصورِ تقدیر میں ارتقا، خود احتسابی اور مسلسل بہتری کے اصول کی عکاسی کرتا ہے۔ رموز اور اسرار کے اشعار کی تعداد کا تقریباً برابر ہونا اور دونوں مثنویوں کے آغاز میں جلال الدین رومی کے ایک شعر کو بطورِ انتساب شامل کرنا اس فکری تسلسل کی علامت ہے جس کے ذریعے اقبال ملتِ اسلامیہ کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے یہ پیغام دیتے ہیں کہ قوم کی تقدیر اس کے اپنے اعمال، اتحاد اور روحانی و اخلاقی بیداری سے وابستہ ہے، اور یہی اصول ان کے فلسفۂ تقدیر کی اساس قرار پاتے ہیں:

فرد را ربط جماعت رحمت است
جوہر راہ کمال از ملت است
فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرہ وسعت طلب قلزم شود
فرد تنہا از مقاصد غافل است

قوتش آشفتگی را مائل است
در جماعت خود شکن گردد خودی
ناز گلبرگ چمن گردد خودی[۱۵]

ان اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ملت دراصل افراد کے باہمی اختلاط و ارتباط سے وجود میں آتی ہے اور اس کی صحیح تربیت اور تکمیل نبوت کی رہبری میں ممکن ہوتی ہے، جس کی بنیاد عقیدۂ توحید پر استوار ہوتی ہے۔ اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق قوم کی اجتماعی تقدیر کسی اتفاقی یا جبری عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایمان، اتحاد اور منظم اجتماعی زندگی کے ذریعے تشکیل پاتی ہے۔ اسی لیے وہ ملتِ اسلامیہ کو اقوامِ عالم میں قابلِ تقلید قرار دیتے ہیں، کیونکہ اس کی اساس توحید ہے جو افراد کے اندر اعتماد، حوصلہ اور مقصدیت پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس یاس، حزن اور خوف کو اقبال حیاتِ ملی کے لیے ناقص قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہ صفات قوم کی عملی قوت کو کمزور کر دیتی ہیں اور اسے اپنی تقدیر سنوارنے کی جدوجہد سے دور کر دیتی ہیں۔ یوں رموزِ بے خودی میں ان اشعار کے ذریعے یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ فرد اور ملت کا مضبوط تعلق، عقیدۂ توحید کی بنیاد اور اجتماعی نظم وضبط ہی وہ عوامل ہیں جو قوم کو زوال سے نکال کر ایک باوقار اور فعال تقدیر کی طرف لے جاتے ہیں، اور یہی اقبال کے فلسفۂ تقدیر کا بنیادی پیغام ہے:

گر خدا داری زغم آزاد شو
از خیال بیش و کم آزاد شو
ہر کہ رمز مصطفیٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است[۱۶]

رموزِ بے خودی میں علامہ اقبال نے مکالمۂ "تیر و شمشیر" اور حکایتِ "شیر و شہنشاہ عالمگیر" کے ذریعے عقیدۂ توحید کی اہمیت اور اس کے عملی تقاضوں کی وضاحت کی ہے۔ اقبال کے تصورِ تقدیر کے مطابق توحید محض ایک نظری عقیدہ نہیں بلکہ ایک زندہ قوت ہے جو فرد اور ملت کے اندر اعتماد، وحدت اور مقصدیت پیدا کرتی ہے اور انھیں اپنی تقدیر کی تعمیر کے لیے متحرک بناتی ہے۔ ان تمثیلات کے ذریعے اقبال یہ باور کراتے ہیں کہ جب قوم توحید کے اصول پر قائم رہتی ہے تو اس کے اندر نظم، استقامت اور اجتماعی طاقت پیدا ہوتی ہے، جو اسے زوال سے نکال کر عروج کی طرف لے جاتی ہے۔

علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کے دوسرے اساسی پہلو یعنی رسالت کی برکتوں کو بیان کرتے ہیں جس سے ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ملت کی تربیت اور اس کی تقدیر کی صحیح سمت کا تعین دراصل نبوت و رسالت کی رہنمائی سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اقبال کے نزدیک توحید اور رسالت وہ بنیادی اصول ہیں جو ملت کی فکری و عملی زندگی کو منظم کرتے ہیں اور اسے ایک فعال، باوقار اور مستحکم تقدیر کی طرف رہنمائی فراہم کرتے ہیں؛ یوں رموزِ بےخودی میں یہ دونوں عناصر ملت کی بقا، استحکام اور تاریخی ارتقا کے بنیادی ستون قرار پاتے ہیں:

حق تعالی پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید
از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما
دین فطرت از نبی آموختیم
در رہ حق شعلہ افروختیم
پس خدا برما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد[۱۷]

رموزِ بےخودی میں علامہ اقبال نے رسالتِ محمدیہ کے مقصد کو سماجی و روحانی نظام کے طور پر پیش کیا ہے جس کا مقصد معاشرے میں حریت، مساوات اور اخوت کو فروغ دے کر انسانیت کی فلاح اور روحانی سکون کا حصول ہے اور ان کے تصورِ تقدیر کے مطابق یہ مقاصد محض نظری نہیں بلکہ عملی جدوجہد، ایثار اور قربانی کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں جن کی وضاحت "حکایتِ بو عبیدہ و جابان"، "حکایتِ سلطان مراد و معمار" اور "حادثۂ کربلا" جیسے تمثیلی واقعات سے کی گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کی بنیاد نسل یا وطن نہیں بلکہ قرآن کے ابدی اصولوں پر ہے جس کا مرکزی محور توحید اور رسالت ہے، اور یہی نظامِ حیات جامد نہیں بلکہ اجتہاد اور ارتقا کی گنجائش رکھنے والا ایک متحرک فکری ڈھانچہ ہے جو ملت کی تقدیر کو تشکیل دیتا ہے، کیونکہ ملی خودی اسی وقت وجود پاتی ہے جب قوم اپنی دینی و اخلاقی اقدار کو عملی طور پر اختیار کرے، اور اسی تناظر میں قوت، عشق اور خودی کو اقبال کے فلسفۂ تقدیر میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، جہاں قوت زندگی کو معنی دیتی ہے، عشق اسے سمت عطا کرتا ہے اور خودی

اسے عملی وجود میں ڈھالتی ہے، یوں اقبال کا پیغام یہ ہے کہ فرد اور ملت دونوں کی تقدیر اطاعتِ الٰہی، مسلسل سعی اور اجتماعی نظم و وحدت کے ذریعے ہی استحکام اور عروج حاصل کرتی ہے۔ اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں علامہ اقبال کے ہاں قوت اور عشق کے تصورات کی تشکیل میں جلال الدین رومی اور فریڈرک نطشے کے اثرات نمایاں ہیں۔ رومی سے اقبال نے عشق اور روحانی بلندی کا تصور لیا جبکہ نطشے سے قوتِ ارادی اور صلابتِ کردار کا تصور جھلکتا ہے۔ اس کی مثال اسرارِ خودی کی حکایتِ الماس و زغال (ہیرا اور کوئلہ) میں ملتی ہے، جس میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ زندگی اسی کے لیے روشن ہوتی ہے جو سخت کوش اور مضبوط ارادے والا ہو، کیونکہ کمزوری دراصل بے معنی اور ناپختگی ہے، اور یہی نکتہ اقبال کے فلسفۂ تقدیر میں اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فرد اور ملت کی تقدیر کا انحصار ان کی داخلی قوت اور عمل پر ہوتا ہے:

می شود از وے دو عالم مستنیر
ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی ناکسی ناپختگی است[18]

اسرار خودی میں علامہ اقبال کے ہاں قوت اور سخت کوشی کے تصور میں فریڈرک نطشے سے وقتی مماثلت ضرور نظر آتی ہے، اسی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پہلو میں نطشے کا اثر اقبال کو ایک حد تک قابلِ قبول محسوس ہوا، تاہم دونوں کے فکری راستے بنیادی طور پر مختلف ہیں کیونکہ اقبال کا تصورِ قوت توحید، عشق اور اخلاقی نظم سے جڑا ہوا ہے جبکہ نطشے کا فلسفہ فرد کی محض ارادی قوت پر قائم ہے۔ یوں اقبال کے نزدیک حقیقی تقدیر وہی ہے جو ایمان اور اخلاق کے ساتھ مربوط قوت سے تشکیل پائے، نہ کہ صرف طاقت کے فلسفے سے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کے لفظوں میں صرف یہ کہنا کافی ہو گا:

> چونکہ اقبال نطشے سے بزرگ تر شاعر ہے، اس لیے ”پتھر کو اس طرح کاٹا اور صیقل کیا ہے کہ الماس اس کا اپنا بن گیا ہے۔[19]

رموزِ بے خودی کی اشاعت کے ساتھ علامہ اقبال کا فلسفۂ حیات اپنی مکمل اور مربوط شکل میں سامنے آیا، جس نے اسرارِ خودی کے ساتھ مل کر ان کے تصورِ تقدیر کو ایک واضح فکری نظام کی صورت

دے دی، جس میں فرد اور ملت کی تقدیر کو محض جبر یا اتفاق کے بجائے شعور، عمل اور اخلاقی ارتقا کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ ابتدا میں اگرچہ اسرارِ خودی کے بعض پہلوؤں پر ناقدین کو ابہام محسوس ہوا، لیکن رموزِ بے خودی نے اس فکری الجھن کو بڑی حد تک دور کر دیا، اور یوں اقبال کا تصورِ تقدیر مشرق و مغرب دونوں میں ایک انقلابی فکر کے طور پر تسلیم کیا جانے لگا۔ اس اثر کے نتیجے میں ان کی دونوں مثنویوں کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے اور ان پر تحقیقی و تنقیدی کام بھی سامنے آیا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اقبال کے نزدیک تقدیر کوئی جامد حقیقت نہیں بلکہ ایک متحرک، ارتقائی اور تخلیقی عمل ہے، جس کی بنیاد خودی کی تربیت اور اجتماعی شعور پر قائم ہے۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

> رموز بے خودی کو میں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترتیب مضامین کرتے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی تو دو تین ضروری مضامین باقی ہیں یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود، حیات ملت اسلامیہ میں کیا ہے؟ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصہ مثنوی کو ختم سمجھنا چاہیے ایسے مطالب ذہن میں آئے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لیئے موجب حیرت و مسرت ہوں گے کیوں کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ملت اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے اسکول کے مسلمانوں کو معلوم ہو گا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چھیڑا ہے، قومیت کے اصول تو صرف اسلام نے ہی بنائے ہیں جن کی پختگی اور پائداری مرورِ ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔[۲۰]

اقبال کی مثنویوں میں فلسفۂ تقدیر کا ایک اہم تحقیقی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تقدیر کو جامد اور ازلی فیصلہ قرار دینے کے بجائے ایک متحرک اور عملی حقیقت کے طور پر پیش کیا۔ ان کے نزدیک فرد اور ملت اپنی جدوجہد، شعور اور اجتماعی عمل کے ذریعے اپنی تقدیر کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں تقدیر کا تصور انسان کو بے عملی کے بجائے حرکت اور ذمہ داری کا درس دیتا ہے۔ ان مثنویوں میں فلسفے کا غلبہ دراصل ایک شعوری فکری حکمتِ عملی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اقبال نے شاعری کو محض حسنِ بیان کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے ملت کی تقدیر سازی اور فکری بیداری کا وسیلہ بنایا، جو ان کی فکر کا ایک منفرد اور تحقیقی طور پر اہم پہلو ہے۔ ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کا خیال ہے کہ:

"اسرار خودی" زیادہ حقیقی اور "رموز" زیادہ تخیلی ہے۔ "رموز" میں اگر تھوڑی سی حکایتیں اور ہو جائیں تو دماغ پر بھی وہی گرفت ہوتی جو "اسرار" کی ہے۔ یہ کمی رموز کے نصف آخر میں خصوصاً بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔[21]

علامہ اقبال نے تقدیر کو صرف مذہبی یا اخلاقی مسئلہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک اجتماعی تمدن، حکمتِ عملی (civilizational strategy) کے طور پر پیش کیا۔ ان کی مثنویوں میں تقدیر کا تصور فرد کے باطنی ارتقا تک محدود نہیں رہتا بلکہ اسے قوموں کے عروج وزوال اور تاریخی تبدیلی کے اصول سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو اقبال کے ہاں تقدیر دراصل ایک تاریخی اور سماجی قانون کی صورت اختیار کر لیتی ہے، جس کے تحت وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ جو قومیں شعور، عمل اور تنظیم کو اختیار کرتی ہیں وہ اپنی تقدیر خود تشکیل دیتی ہیں۔ چنانچہ تحقیقی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال نے تقدیر کے تصور کو محض عقیدے سے نکال کر اجتماعی عمل اور تاریخ سازی کے نظریے میں تبدیل کر دیا، اور یہی ان کی فکر کا ایک منفرد اور جدید پہلو ہے:

مولانا ابوالکلام آزاد کی مشہور تصنیف "تذکرہ" کے دیباچہ نگار کا یہ لکھنا کہ اقبال کی مثنویاں تحریک "الہلال" ہی کی بازگشت ہیں "کسی طرح درست نہیں۔[22]

نومبر ۱۹۱۹ء کو علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اقبال نے اس قسم کے بے بنیاد الزام پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

شاید ان کو دیباچہ نگار کو معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریروں نظم ونثر وانگریزی واردو میں موجود ہیں۔[23]

خطبات اقبال میں تقدیر کا فکری پہلو:

علامہ اقبال کے خطبات، جو بعد میں تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کی صورت میں سامنے آئے، اسلامی فکر کی از سرِ نو تعبیر کی ایک سنجیدہ اور بامقصد کوشش ہیں۔ ان خطبات میں اقبال نے تقدیر کے تصور کو محض ایک جامد اور ازلی فیصلہ نہیں سمجھا بلکہ اسے انسانی عمل، ارادہ اور تخلیقی صلاحیت سے وابستہ ایک متحرک حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اقبال کے نزدیک قرآن حکیم انسان کو عمل، جستجو اور مسلسل ارتقاء کی دعوت دیتا ہے، اس لیے تقدیر بھی انسان کی عملی جدوجہد اور شعوری فیصلوں کے ساتھ مربوط ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں اس امر پر زور دیا کہ جدید سائنسی اور فلسفیانہ افکار کے تناظر میں

تقدیر کے مسئلے کو نئے انداز سے سمجھنے کی ضرورت ہے، تاکہ مسلمان جمود اور تقلید کی بجائے تخلیقی فکر اور اجتہادی رویہ اختیار کریں۔ چنانچہ اقبال کا تصورِ تقدیر ایک فعال، ارتقائی اور حوصلہ افزا نظریہ ہے جو فرد اور ملت دونوں کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی تقدیر سنوارنے کی ترغیب دیتا ہے۔ یہی فکری پہلو اقبال کے خطبات میں تصورِ تقدیر کی اصل روح اور معنویت کو واضح کرتا ہے۔

The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam کے انگریزی خطبات پر مبنی ایک شاہکار تصنیف ہے۔ ان خطبات میں دورِ جدید کے اہم افکار و نظریات کو اسلامی حکمت کے حوالے سے بنیادی مسائل کو مغربی افکار و تصورات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر ان خطبات کو تصورِ تقدیر کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے تقدیر کے مسئلے کو محض روایتی اور جامد عقیدے کے طور پر نہیں لیا بلکہ اسے جدید فکری اور سائنسی شعور کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک متحرک اور با معنی تصور کی صورت میں پیش کیا ہے۔

۱۹۵۸ء میں بزمِ اقبال لاہور سے اس کتاب کا اردو ترجمہ ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ ترجمہ، سید نذیر نیازی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور جیسا کہ خود انھوں نے بیان کیا ہے:

> یہ ترجمہ انھوں نے علامہ کے ارشاد پر ان کی زندگی ہی میں ہر طرح سے مکمل کر لیا تھا لیکن بعض وجوہ سے جلد شائع نہ ہو سکا۔[۲۴]

تصورِ تقدیر کے فکری پہلو کے حوالے سے یہ خطبات اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک تقدیر کوئی جامد اور حتمی فیصلہ نہیں بلکہ ایک متحرک حقیقت ہے جو انسان کے علم، ارادے اور عمل سے وابستہ ہے۔ انھوں نے جدید دور کے فکری مباحث کو سامنے رکھتے ہوئے تقدیر کی نئی تعبیر پیش کی، جس کا مقصد مسلمانوں کو جبر اور بے عملی کے تصور سے نکال کر شعوری جدوجہد اور تخلیقی عمل کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ اس طرح یہ خطبات تقدیر کو ایک ارتقائی اور عملی تصور کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس میں انسان اپنی کوشش اور بصیرت کے ذریعے اپنی زندگی اور اجتماعی مستقبل کو سنوار سکتا ہے۔ اقبال کی رائے میں ان لیکچرز کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلامی فکر کو اس انداز میں پیش کیا جائے جس سے انسان اپنی ذمہ داری اور اختیار کو سمجھے اور اپنی تقدیر کی تعمیر میں فعال کردار ادا کرے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب انسان اپنی فکری اور عملی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے تو وہ تقدیر کے فیصلوں کو بہتر رخ دے سکتا ہے۔ اس طرح ان خطبات کو وہ اپنے تفکرِ اسلامی کا حاصل اس لیے قرار دیتے تھے کہ ان میں تقدیر کے

مسئلے کو ایک نئے، بیدار کن اور عملی نقطۂ نظر سے واضح کیا گیا ہے، جو فرد اور ملت دونوں کی ترقی اور ارتقاء کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے:

اگر یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے دور میں شائع ہوتی تو یقیناً اسلامی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا ذریعہ بن جاتی۔[۲۵]

تصورِ تقدیر کے فکری پہلو کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اپنے ان خطبات کو تقدیر، اختیار اور انسانی عمل جیسے بنیادی مسائل کی وضاحت کا جامع ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تقدیر کو سمجھنے کے لیے محض روایتی عقائد پر اکتفا کرنا کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے گہری فکری جستجو اور جدید علمی شعور کی ضرورت ہے:

سید نذیر نیازی کے اردو ترجمے کے بعد ان خطبات تک رسائی عام ہو گئی ورنہ اس سے پہلے صرف وہی لوگ استفادہ کرتے تھے جو مشرق و مغرب کے جدید فلسفیانہ مسائل کے ساتھ انگریزی تحریر کے دقیق اور منطقیانہ اسلوب تحریر سے بھی پوری طرح آشنا ہوں۔ اقبال کے۔ مبصرین کا یہ خیال کہ ان خطبات کی مزید تشریحات اردو میں شائع ہونی چاہئیں، بہت درست ہے۔[۲۶]

ان خطبات میں اقبال نے خود کو جدید اسلامی علمِ کلام کے ایک نمایاں مفکر کے طور پر پیش کیا اور اسلام اور عقل و فکر کے باہمی ربط پر جدید نقطۂ نگاہ سے بحث کی۔ تصورِ تقدیر کے حوالے سے انھوں نے یہ واضح کیا کہ اسلام انسان کو بے بس اور مجبور نہیں سمجھتا بلکہ اسے شعور، ارادہ اور عمل کی قوت عطا کرتا ہے۔ اس طرح اقبال کا فکری پیغام یہ ہے کہ تقدیر ایک فعال اور ارتقائی حقیقت ہے، جسے انسان اپنی محنت، بصیرت اور اخلاقی ذمہ داری کے ذریعے بہتر سمت دے سکتا ہے، اور یہی طرزِ فکر جدید اسلامی فلسفے میں نئی راہیں متعین کرتا ہے۔ تصورِ تقدیر کے فکری پہلو کے تناظر میں یہ بات مزید اہم ہو جاتی ہے کہ اقبال کے بعد پیدا ہونے والے سماجی، سائنسی اور فکری حالات نے تقدیر کے مسئلوں کو نئے سوالات سے جوڑ دیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان خطبات کو موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق پرکھا جائے اور ان کی معنویت کو واضح کیا جائے۔ خود اقبال نے بھی اپنی تمہید میں اس امر پر زور دیا تھا کہ انسانی فکر مسلسل ارتقاء پذیر ہے اور اس کے مسائل کو سمجھنے کے لیے آزادانہ تنقید اور گہری فکری جستجو ناگزیر ہے:

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ دین کے علم کو جدید حکیمانہ انداز در سائنٹیفک طرز فکر کے ساتھ پیش کیا جائے میں نے اس تقاضے کو ان خطبات میں ایک حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز سے سامنے آئے کہ دین و دانش اور مذہب و سائنس میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ افکار اور قیاس آرائیوں میں کوئی قطعیت نہیں ہوتی۔ علم کی ترقی سے فکر کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔[۲۷]

یوں اقبال کا تصورِ تقدیر ایک زندہ اور متحرک نظریہ ہے، جسے ہر دور کے حالات میں نئے انداز سے سمجھنے اور بیان کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ علامہ اقبال کے خطبات کی روشنی میں تحقیقی حوالے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تقدیر کوئی جامد اور حتمی فیصلہ نہیں بلکہ ایک مسلسل جدوجہد اور شعوری عمل ہے، جس میں فرد اور ملت دونوں اپنی فکری بصیرت، اخلاقی قوت اور عملی کوشش کے ذریعے اپنی زندگی اور مستقبل کو سنوار سکتے ہیں۔ اس طرح اقبال کا تصورِ تقدیر انسان کو جبر کے بجائے اختیار، عمل اور ارتقا کی طرف متوجہ کرتا ہے، جو ان کے فکری پہلو کی بنیادی خصوصیت ہے:

ہمارا فرض یہ ہے کہ فکر انسانی کے ارتقا پر نظر رکھیں اور آزادانہ تنقید کا اسلوب قائم رکھیں۔[۲۸]

سید نذیر نیازی کے مطابق تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے ساتوں خطبات دراصل علامہ محمد اقبال کے اس فکری نظام کی وضاحت کرتے ہیں جس میں تصورِ تقدیر کو ایک متحرک اور تخلیقی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک علم، وجدان، دعا، اختیار اور حرکت ایسے بنیادی عناصر ہیں جو انسان کو اپنی تقدیر کی تشکیل میں فعال کردار ادا کرنے کی صلاحیت دیتے ہیں:

"تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کی کتاب میں اگرچہ علم و فکر کے بہت سے پہلو اور عہد حاضر کی تہذیبی زندگی کے متعدد مسائل زیر بحث آئے ہیں لیکن حقیقت میں وہ سب تین خاص محور، اسلام، فلسفہ اور مذہب پر گردش کرتے ہیں۔[۲۹]

اقبال کے خطبات کو مد نظر رکھتے ہوئے تصورِ تقدیر اس فکری اصول پر قائم نظر آتا ہے کہ عقل، وجدان اور مذہب ایک دوسرے کے معاون اور تکمیلی ذرائع ہیں۔ اقبال کے نزدیک قرآن انسان کو زندگی اور کائنات پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، اس لیے تقدیر کو محض ایک جبری اور جامد حقیقت نہیں سمجھا جا سکتا۔ ان کے خطبات سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسان منظم عقل، سائنسی شعور اور روحانی بصیرت کے ذریعے اپنی زندگی کے فیصلوں میں فعال کردار ادا کرتا ہے اور اسی شعوری جدوجہد کے ذریعے اپنی تقدیر کی تشکیل کرتا ہے، یوں اقبال کے تصورِ تقدیر کا فکری پہلو حرکت، اختیار اور مسلسل ارتقا کے اصولوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔

اقبال کے خطوط و نثری بیانات میں تقدیر کی وضاحت

علامہ محمد اقبال نہ صرف ایک عظیم شاعر اور مفکر تھے بلکہ ایک بلند پایہ مصنف بھی تھے۔ ان کی نثر ان کے فکر و فلسفہ، خصوصاً تصورِ تقدیر کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اقبال کے خطوط، مقالات

اور خطبات میں تقدیر کی وضاحت ایک منطقی، سنجیدہ اور استدلالی انداز میں ملتی ہے، جس کے ذریعے وہ تقدیر کو ایک فعال اور متحرک عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کی نثری تصانیف جیسے علم الاقتصاد، The Reconstruction of Religious Thought in Islam (تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)، Letters of Iqbal، مکاتیبِ اقبال اور Speeches, Writings and Statements of Iqbal اس امر کی واضح مثال ہیں کہ انھوں نے تقدیر کے مسئلے کو محض نظری بحث کے طور پر نہیں بلکہ عملی زندگی سے جوڑ کر بیان کیا۔ اقبال کی نثری تحریروں میں تقدیر کا تصور فرد اور ملت کی خودی، اختیار اور مسلسل جدوجہد کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔ ان کے خطوط اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی تقدیر کو سنوار سکتا ہے اور یہی پیغام ان کی فکری تعلیمات کا مرکزی نکتہ ہے۔ اس اقبال کی نثر نہ صرف اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے بلکہ ان کے تصورِ تقدیر کو سمجھنے کے لیے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، جو ان کے شعری افکار کی تشریح اور تکمیل کرتی ہے۔

علم الاقتصاد: علامہ اقبال کی اردو نثر میں پہلی باقاعدہ تصنیف "علم الاقتصاد" ہے۔ ۱۸۹۹ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کرنے کے بعد جب اقبال نے اورینٹل کالج اور بعد ازاں گورنمنٹ کالج میں تدریسی فرائض انجام دیے تو اسی دوران انھوں نے معاشیات کے موضوع پر یہ کتاب تصنیف کی۔ اس ابتدائی نثری تصنیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال شروع ہی سے علمی اور فکری مسائل کو عقلی اور استدلالی انداز میں بیان کرنے کے عادی تھے، اور یہی انداز بعد میں ان کے خطوط، خطبات اور دیگر نثری تحریروں میں اور تصورِ تقدیر میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ کشن پرشاد کو علامہ اقبال نے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> تصنیف و تالیف کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے۔ "علم الاقتصاد" پر اردو میں سب سے پہلی مستند کتاب میں نے لکھی ہے۔[۳۰]

علامہ محمد اقبال کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف "علم الاقتصاد" ۱۹۰۳ء میں لاہور کے ایک اشاعتی ادارے سے تقریباً دو سو سولہ صفحات پر مشتمل شائع ہوئی۔ بعد ازاں اسے مختلف ادوار میں نئے مقدمات اور پیش لفظ کے ساتھ دوبارہ شائع کیا گیا، جن میں ۱۹۶۲ء میں اقبال اکادمی پاکستان کی اشاعت بھی شامل ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ کئی پہلوؤں سے اہم ہے کیونکہ اس میں اقبال نے معاشیات کی تعریف اور اس کی

افادیت بیان کرنے کے ساتھ اہلِ برصغیر کو علمی اور عملی مسائل کے شعوری ادراک کی طرف متوجہ کیا۔ یہ اندازِ فکر بعد میں ان کے خطوط اور نثری بیانات میں تقدیر کے تصور کی وضاحت میں بھی نمایاں نظر آتا ہے، جہاں وہ انسان کو حالات کا محکوم نہیں بلکہ شعور اور عمل کے ذریعے اپنی تقدیر سنوارنے والا فاعل قرار دیتے ہیں۔ اس تصنیف کی تیاری میں اقبال نے علمی دیانت داری اور تحقیقی طرزِ تحریر کو ملحوظ رکھا اور واضح کیا کہ یہ کسی ایک کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ متعدد مستند ماخذات سے استفادہ کرکے مرتب کی گئی ہے۔ انھوں نے نئی اصطلاحات وضع کیں اور مشکل مفاہیم کو سادہ اور واضح انداز میں بیان کیا، جو ان کی نثر کے منطقی اور استدلالی اسلوب کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کتاب تھامس آرنلڈ کی تحریک پر لکھی گئی اور اس کی زبان کی اصلاح میں شبلی نعمانی کی معاونت شامل تھی۔ اس پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کی ابتدائی نثری کاوشیں بھی فکری سنجیدگی اور عملی رہنمائی پر مبنی تھیں، اور یہی خصوصیات بعد میں ان کے خطوط و بیانات میں تصورِ تقدیر کی عقلی اور عملی تشریح کی بنیاد بنیں۔

فلسفہ عجم: علامہ محمد اقبال کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ان کا وہ مقالہ ہے جس پر جرمنی کی میونخ یونیورسٹی نے نومبر ۱۹۰۷ء میں انھیں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی۔ بعض اہلِ علم نے اس ڈگری کی تاریخ ۱۹۰۸ء بیان کی ہے، تاہم درست تاریخ ۱۹۰۷ء ہی تسلیم کی جاتی ہے۔ یہ مقالہ بعد میں انگریزی زبان میں The Development of Metaphysics in Persia کے عنوان سے ۱۹۰۸ء میں لندن سے شائع ہوا اور بعد ازاں اسے مختلف علمی اداروں نے دوبارہ شائع کیا۔ اس تحقیقی تصنیف میں اقبال نے فلسفہ اور فکر کے ارتقا کا تاریخی و عقلی جائزہ پیش کیا، جو ان کے سنجیدہ اور استدلالی نثری اسلوب کی نمایاں مثال ہے۔ اس مقالے کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ اس کے اصل مسودے میں اقبال کی علمی شخصیت اور فکری رجحانات کا ابتدائی نقش ملتا ہے، جو بعد میں ان کے خطوط اور نثری بیانات میں تصورِ تقدیر کی وضاحت کی بنیاد بنتا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ میر حسن الدین نے اقبال کی اجازت سے کیا اور یہ ترجمہ ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال کی علمی و تحقیقی کاوشیں محض فلسفیانہ مباحث تک محدود نہیں تھیں بلکہ ان میں انسانی اختیار، ارتقا اور تقدیر کے مسائل کو عقلی بنیادوں پر سمجھنے اور بیان کرنے کی کوشش بھی شامل تھی، جو بعد ازاں ان کے خطوط و بیانات میں زیادہ واضح اور عملی صورت میں سامنے آتی ہے:

یہ کتاب پہلے لکھی گئی تھی اس وقت سے اب تک نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے جرمن زبان میں غزالی، طوسی وغیرہ پر علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا حصہ ایسا ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔[۳۱]

علامہ محمد اقبال نے اپنے اس تحقیقی مقالے "The Development of Metaphysics in Persia" میں نہایت عالمانہ انکسار اور تحقیقی دیانت کا مظاہرہ کیا ہے۔ علمی تحقیقات خواہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو جائیں، ان کی افادیت اور انفرادیت برقرار رہتی ہے، کیونکہ علم کی دنیا میں ہر نئی تحقیق سابقہ افکار سے رہنمائی حاصل کر کے آگے بڑھتی ہے۔ اسی بنا پر اقبال کا یہ مقالہ علمی تاریخ میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اس تصنیف کی اہمیت صرف فلسفیانہ مباحث تک محدود نہیں بلکہ اس نے اقبال کے فکری نظام، خصوصاً تصورِ خودی اور انسانی اختیار و تقدیر کے باہمی تعلق کی بنیاد فراہم کی، جس کے بغیر ان کے خطوط اور نثری بیانات میں تقدیر کے تصور کو مکمل طور پر سمجھنا ممکن نہیں۔ مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں اس بنیادی ماخذ کو نظر انداز کرنا دراصل ان کے فکری ارتقا کے اہم پہلوؤں سے محروم رہنے کے مترادف ہے۔ اس کتاب میں اقبال نے ایرانی قوم کی فکری و روحانی روایت کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا کہ انسان کی باطنی قوت، ارادہ اور عمل اس کی زندگی کی سمت متعین کرتے ہیں۔ یہی نظریہ بعد میں ان کے خطوط، خطبات اور دیگر نثری تحریروں میں تصورِ تقدیر کی عملی تشریح کی صورت میں سامنے آتا ہے، جہاں وہ تقدیر کو ایک متحرک اور ارتقائی عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور فرد و ملت کو اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی تقدیر سنوارنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں:

الف: میں نے ایرانی تفکر کا منطقی سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کو میں نے فلسفہ جدید کی زبان میں پیش کیا ہے۔

ب: تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹیفک طریقے سے بحث کی ہے اور ان ذہنی حالات و شرائط کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو اس قسم کے واقعے کو معرض ظہور میں لے آتے ہیں۔ لہٰذا اس خیال کے برخلاف جو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تصوف ان مختلف عقلی و اخلاقی قوتوں کے باہمی عمل دانش کا لازمی نتیجہ ہے جو ایک خوابیدہ روح کو بیدار کر کے زندگی کے اعلیٰ ترین نصب العین کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔[۳۲]

علامہ محمد اقبال کا تحقیقی مقالہ The Development of Metaphysics in Persia مختلف اہم حصوں پر مشتمل ہے، جن میں فلسفیانہ افکار کے ارتقا کو تاریخی اور عقلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالے کے ابتدائی حصے میں اسلام سے قبل ایران کے فلسفے اور اس کے نمایاں فکری دھاروں، مثلاً ایرانی ثنویت، زرتشت اور دیگر اصلاحی تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد کے حصوں میں یونانی فلسفے کے اثرات، اسلامی دور میں عقلیت کے عروج وزوال اور تصور و حقیقت کے باہمی تعلق پر بحث کی گئی ہے، جس سے انسانی فکر کی تدریجی تشکیل اور اس کے عملی نتائج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی تسلسل میں مقالے کے آخری حصوں میں تصوف اور اسلامی تصوف کی فکری جہات اور بعد کے ایرانی مفکرین کے نظریات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان مباحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اقبال انسانی شعور، ارادے اور عمل کو تاریخ اور فکر کی ترقی کا بنیادی محرک سمجھتے ہیں۔ یہی فکری پس منظر بعد میں ان کے خطوط اور نثری بیانات میں تصورِ تقدیر کی وضاحت کا سبب بنتا ہے، جہاں وہ تقدیر کو ایک جامد اور غیر متبدل حقیقت کے بجائے انسانی جدوجہد، عقل اور روحانی ارتقا کے ساتھ مربوط ایک متحرک عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ: علامہ محمد اقبال کی اہم نثری تصنیف The Reconstruction of Religious Thought in Islam (تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ) دراصل ان کے خطبات پر مبنی ہے جو انگریزی زبان میں پیش کیے گئے تھے۔ ابتدا میں یہ خطبات ۱۹۳۰ء میں چھ لیکچرز کی صورت میں شائع ہوئے، لیکن بعد میں ایک اور لیکچر کے اضافے کے ساتھ ۱۹۳۴ء میں کتابی شکل میں منظرِ عام پر آئے۔ اس کتاب کے مختلف ایڈیشن بعد میں شائع ہوتے رہے اور اس کا اردو ترجمہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا، جو سید نذیر نیازی کی علمی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ انھوں نے یہ ترجمہ علامہ کی زندگی ہی میں ان کی ہدایت پر مکمل کر لیا تھا، اگرچہ اس کی اشاعت کچھ تاخیر سے ممکن ہو سکی۔ یہ کتاب اقبال کے فکری نظام کو سمجھنے میں بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، خصوصاً تصورِ تقدیر کے حوالے سے۔ ان خطبات میں اقبال نے جدید دور کے فکری اور مذہبی مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے انسان کے اختیار، عقل اور تخلیقی قوت پر زور دیا ہے۔ اس طرح ان کے بیانات اور خطبات میں تقدیر کو ایک جامد اور غیر متبدل حقیقت کے بجائے ایک متحرک اور ارتقائی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جس میں انسان اپنی شعوری کوشش، ایمان اور عمل کے ذریعے اپنی زندگی اور اجتماعی مستقبل کی تشکیل کر سکتا ہے۔ علامہ اقبال نے یہ لیکچر ۱۹۲۸ء میں

اور ۱۹۲۹ء میں مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں دیے تھے اور انھیں اپنے تفکر اسلامی کا حاصل جانتے تھے۔ ان کی رائے میں اگر یہ کتاب خلیفہ مامون الرشید کے دور میں شائع ہوتی تو یقیناً:

اسلامی دنیا میں ایک انقلاب برپا کرنے کا ذریعہ بن کہے ہے۔[۳۳]

۱۷ جنوری ۱۹۳۲ء کے ایک خط بنام عبدالرحیم میں لکھا کہ:

آپ میرے سکس لکچرز غور سے پڑھیں اس میں آپ کے تمام سوالوں کے جواب آجاتے ہیں۔[۳۴]

علامہ محمد اقبال کے خطبات، جو بعد میں The Reconstruction of Religious Thought in Islam (تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ) کی صورت میں مرتب ہوئے، ان کے فکری نظام اور خصوصاً تصورِ تقدیر کو سمجھنے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان خطبات میں اقبال نے خودی، عقل اور اجتہاد کے اصولوں کو بنیاد بنا کر اسلام اور فلسفے کے باہمی ربط پر جدید نقطۂ نظر سے بحث کی اور مسلمانوں کو یہ احساس دلایا کہ تقدیر کوئی جامد اور حتمی فیصلہ نہیں بلکہ انسانی شعور، سائنسی فکر اور عملی جدوجہد کے ساتھ مسلسل تشکیل پانے والا عمل ہے۔ اگرچہ ان خطبات کی زبان نسبتاً سادہ اور واضح ہے، تاہم ان میں بیان کردہ فلسفیانہ نکات اور باطنی مسائل کی گہرائی کے باعث یہ عام قاری کے لیے فوری طور پر آسان نہیں رہتے۔ جب ان خطبات کا اردو ترجمہ سید نذیر نیازی نے شائع کیا تو ان تک وسیع حلقۂ قارئین کی رسائی ممکن ہوئی اور اقبال کے تصورِ تقدیر اور جدید اسلامی فکر کی تفہیم میں آسانی پیدا ہوئی۔ اقبال نے خود ان خطبات کی تمہید میں اس بات پر زور دیا کہ:

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ دین کے علم کو جدید حکیمانہ انداز اور سائنٹیفک طرز فکر کے ساتھ پیش کیا جائے میں نے اس تقاضے کو ان خطبات میں ایک حلا تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی فلسفہ اس انداز سے سامنے آئے کہ دین و دانش اور مذہب و سائنس میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفیانہ افکار اور قیاس آرائیوں میں کوئی قطعیت نہیں ہوتی۔ علم کی ترقی سے فکر کی نئی نئی راہیں کھلیں گی۔ ان کی بدولت میری پیش کردہ تادیلات سے بہت سی تاویلات کا امکان پیدا ہو گا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ فکر انسانی کے ارتقا پر نظر رکھیں اور آزادانہ تنقید کا اسلوب قائم رکھیں۔[۳۵]

علامہ محمد اقبال کی تصنیف The Reconstruction of Religious Thought in Islam میں یہ بنیادی خیال پیش کیا گیا ہے کہ دین، عقل اور وجدان ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں۔ اقبال کے نزدیک قرآن انسان کو غور و فکر اور عملی جدوجہد کی دعوت دیتا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی اور تقدیر کی تشکیل خود کرتا ہے۔ یہی فکری تصور ان کے خطوط اور نثری بیانات میں

بھی نمایاں ہے، جہاں وہ تقدیر کو جامد نہیں بلکہ ایک متحرک اور ارتقائی عمل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ دیگر نثری تحریروں اور خطوط سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اقبال اسلامی فکر کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے اور انسان کو شعور، عمل اور خودی کے ذریعے اپنی تقدیر سنوارنے کی ترغیب دیتے تھے۔

شاد اقبال: مہاراجہ کشن پرشاد اور علامہ محمد اقبال کے درمیان ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۷ء تک کا خط و کتابت کا مجموعہ ان کے فکری اور دوستانہ تعلقات کا اہم ماخذ ہے، جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ۱۹۴۲ء میں ایک مفصل مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس مقدمے میں دونوں شخصیات کی ملاقاتوں اور علمی تعلقات کی تاریخ بیان کی گئی ہے، جو اقبال کے فکری رویے اور اصلاحی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، خصوصاً ان کے خطوط میں جھلکنے والا تصورِ تقدیر، جس میں وہ انسان کو محض حالات کا تابع نہیں بلکہ اپنی عملی جدوجہد کے ذریعے تقدیر ساز قرار دیتے ہیں:

> شاد سے اقبال کا پہلا تعارف ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ اقبال، حیدر آباد میں شاد کی مہمان نوازی اور علم دوستی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے واپسی پر شکریہ کے خط کے ساتھ شاد کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔ یہ جون ۱۹۱۰ء کے مخزن میں شائع ہوا۔ اقبال سے شاد کی دوسری ملاقات ۱۹۱۳ء میں اس وقت ہوئی جب کہ شاد، سیاحت کی غرض سے لاہور پہنچے۔ اس ملاقات کے بعد دونوں کے تعلقات اور بھی استوار ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں اقبال دوسری بار حیدر آباد گئے تو انھیں شاد سے ملاقاتوں کا تیسرا موقع ملا۔ شاد اور اقبال کی یہ آخری ملاقات تھی لیکن باہم مراسلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عمر بھر ایک دوسرے کی رفاقت و محبت سے سرشار رہے۔[۳۶]

اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد کی پہلی ملاقات ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد میں ہوئی، جس کے بعد ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۹ء میں مزید ملاقاتیں ہوئیں اور باہمی تعلقات مضبوط ہوتے گئے۔ اس مجموعے میں شامل خطوط (کل ۴۹ خطوط) مختلف ادوار پر محیط ہیں اور ان میں اقبال کے ذاتی، فکری اور اصلاحی خیالات نمایاں ہیں۔ یہ مکاتیب اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک تقدیر ایک جامد حقیقت نہیں بلکہ مسلسل عمل، شعور اور انسان کی فکری و عملی جدوجہد سے تشکیل پانے والا تصور ہے، جو ان کے تمام نثری بیانات کا مرکزی نکتہ ہے۔

خطوط اقبال: خطوطِ اقبال کے تناظر میں اقبال کے تصورِ تقدیر کو سمجھا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے فکری نظام میں تقدیر کوئی جامد یا غیر متبدل حقیقت نہیں بلکہ ایک متحرک اور عمل سے وابستہ تصور ہے۔ ان کے خطوط سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان اپنی فکری قوت، ارادے اور عملی جدوجہد

کے ذریعے اپنی زندگی کی سمت خود متعین کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس لیے تقدیر کو محض جبر کے معنی میں لینا اقبال کے نقطۂ نظر کے مطابق درست نہیں، بلکہ یہ ایک ایسا نظام ہے جو انسانی شعور اور خودی کی بیداری سے مسلسل تشکیل پاتا رہتا ہے:

> اردو ادب کی تاریخ میں علامہ اقبال کی حیثیت کا تعین بالعموم ان کی شاعری کے حوالے سے کیا جاتا ہے بلاشبہ اپنی شاعرانہ عظمت کے پیش نظر اقبال اردو شاعری کی آبرو ہیں مگر انھوں نے شاعری کے علاوہ نثر کا ایک بڑا ذخیرہ بھی یادگار چھوڑا ہے اور کم ہی لوگوں نے ان کی عظیم نثر و درخور اعتنا سمجھا ہے۔ حالانکہ حضرت علامہ کی نثری تصانیف، بالخصوص ذخیرہ مکاتیب، ان کی شعری تخلیقات سے کسی طور بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ ایک لمحے کے لیے دوسری نثری تخلیقات سے قطع نظر کر دیجیے تو مکاتیب اقبال کے آٹھ مجموعوں کو مددی اعتبار سے بھی تو شعری مجموعوں کے بعد، اولیت حاصل ہے۔ مقدیم طالب کے نقطہ نظر سے علاوہ اقبال کلام اقبال کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند تفسیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مزید براں اقبال کی شخصیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے خطوط کی اہمیت کلیدی ہے۔[۳۷]

اقبال کے مکتوبات میں فرد اور ملت کی تقدیر کو باہمی ربط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ فرد کی فکری اور عملی ترقی ملت کی اجتماعی تقدیر پر براہ راست اثر ڈالتی ہے۔ جب فرد اپنی خودی کو پہچان کر عمل اور جدوجہد کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ نہ صرف اپنی تقدیر سنوارتا ہے بلکہ پوری قوم کی تقدیر کے رخ کو بھی بدل دیتا ہے۔ اس کے برعکس جمود، بے عملی اور فکری کمزوری فرد اور ملت دونوں کو زوال کی طرف لے جاتی ہے، جو اقبال کے تصورِ تقدیر کی عملی تعبیر کو واضح کرتی ہے۔

حاصلِ تحقیق یہ ہے کہ علامہ محمد اقبال نے اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی میں تصورِ تقدیر کو روایتی جبریت، بے عملی اور پہلے سے طے شدہ ناقابلِ تغیر فیصلے کے محدود مفہوم سے نکال کر ایک جامع، حرکی اور تخلیقی فلسفۂ حیات میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسرارِ خودی میں فرد کی تقدیر اس کی خودشناسی، عشق، قوتِ ارادی، اخلاقی تربیت اور مسلسل عمل سے وابستہ ہے، جہاں اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کے مراحل سے گزر کر انسان اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو بالفعل حقیقت میں بدلتا اور اپنی تقدیر کے ظہور میں فعال کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے مقابل رموزِ بے خودی فرد کی اس تربیت کو ملت کے اجتماعی وجود، توحید، رسالت، شریعت، اخوت، مساوات، نظم اور ایثار کے ساتھ مربوط کرتی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے کہ انفرادی خودی کی تکمیل صالح اجتماعی زندگی کے بغیر ممکن نہیں اور ملت کی تقدیر بھی اس کے

افراد کے ایمان، کردار، اتحاد اور منظم جدوجہد سے تشکیل پاتی ہے۔ اقبال کے ہاں بے خودی، خودی کی نفی یا فرد کی انفرادیت کا خاتمہ نہیں، بلکہ اسے ایک اعلیٰ اخلاقی اور اجتماعی مقصد سے وابستہ کرکے مزید استحکام عطا کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح انھوں نے ایسے صوفیانہ، فلسفیانہ اور تہذیبی تصورات کو تنقید کا نشانہ بنایا جو انسان کو ترکِ عمل، خوف، تقلید اور جبرِ تقدیر کا اسیر بناتے ہیں؛ تاہم ان کی تنقید حقیقی تصوف کے خلاف نہیں بلکہ اس جامد تعبیر کے خلاف ہے جو عشق، قوت، اخلاقی ذمہ داری اور تخلیقی عمل کو کمزور کرتی ہے۔ اقبال کے خطبات، خطوط اور دیگر نثری بیانات بھی ان مثنویوں میں پیش کردہ فلسفۂ تقدیر کی توثیق کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ فرد و ملت کی زندگی میں علم، اجتہاد، خود احتسابی اور مسلسل ارتقا ناگزیر ہیں۔ چنانچہ ان دونوں مثنویوں کا مشترکہ پیغام یہ ہے کہ تقدیر انسان اور قوم پر باہر سے مسلط ہونے والی زنجیر نہیں، بلکہ خدا کے عطا کردہ امکانات، اخلاقی قوانین اور تاریخی مواقع کے اندر شعوری و ذمہ دارانہ عمل سے تشکیل پانے والی حقیقت ہے۔ یوں اقبال کا فلسفۂ تقدیر فرد کو باکردار انسان، ملت کو منظم تہذیبی قوت اور تاریخ کو انسانی و اجتماعی جدوجہد کا میدان بنا کر عصرِ حاضر کے انسان کو جمود و محکومی سے نکلنے اور ایمان، خودی، اتحاد اور عمل کے ذریعے اپنے مستقبل کی تعمیر کا حیات آفریں راستہ دکھاتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱ محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، شیخ غلام علی اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص: ۷، ۸

۲ ایضاً، ص: ۲

۳ ایضاً، ص: ۱۹، ۲۰

۴ ایضاً، ص: ۳۳

۵ ایضاً، ص: ۳۴

۶ سید عبدالواحد معینی، باقیاتِ اقبال، مجلس اقبال، کراچی، ۱۹۵۲، ص: ۱۸۸،۱۸۷

۷ خیابان (اقبال نمبر)، شعبۂ اردو، پشاور یونیورسٹی، شمارہ ۴، بابت جون، ۱۹۶۲، ص: ۲۲

۸ عطاءاللہ، شیخ (مرتب)، اقبال نامہ (حصہ دوم)، شیخ محمد اشرف، لاہور، طبع اول، سن ندارد، ص: ۵۴

۹ حکیم یوسف حسن، مرتبہ، نیرنگ خیال (اقبال نمبر)، لاہور، ۱۹۳۲، بابت ستمبر، اکتوبر، ۱۹۳۲ء، ص: ۱۲۰

۱۰ غلام دستگیر رشید، آثارِ اقبال، ادارۂ اشاعت، حیدر آباد، دکن، ۱۹۴۴، ص: ۲۶۲۲

۱۱ عطاءاللہ، شیخ (مرتب)، اقبال نامہ (حصہ اول)، شیخ محمد اشرف، لاہور، طبع اول، سن ندارد، ص: ۴۵

۱۲ اردو، اقبال نمبر، طبع جدید، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۰، ص: ۳۵

۱۳ عطاءاللہ، شیخ (مرتب)، اقبال نامہ، (حصہ اول)، ص: ۲۳

۱۴ تصدق حسین تاج، مضامین اقبال، اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد دکن، ص: ۵۵

۱۵ غلام رسول مہر (مرتب)، سرودِ رفتہ، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۹، ص: ۲۵۹

۱۶ محمد اقبال، علامہ، اسرارِ خودی، غلام علی پرنٹرز، لاہور، طبع ۱۳، ۱۹۸۸، ص: ۹۵

۱۷ ایضاً، ص: ۱۰۱

۱۸ محمد اقبال، علامہ، اسرار و رموز، ص: ۶۴

۱۹ حکیم یوسف حسن، مرتبہ، نیرنگ خیال (اقبال نمبر)، لاہور، ۱۹۳۲، بابت ستمبر، اکتوبر، ۱۹۳۲ء، ص: ۱۳۶

۲۰ قاضی احمد میاں اختر، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۵، ص: ۱۲۹

۲۱ حکیم یوسف حسن، مرتبہ، نیرنگ خیال (اقبال نمبر)، ص: ۱۴۰

۲۲ قاضی احمد میاں اختر، اقبالیات کا تنقیدی جائزہ، اقبال اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۵، ص: ۲۸

۲۳ عطاءاللہ، شیخ (مرتب)، اقبال نامہ، (حصہ اول)، ص: ۱۱۰

۲۴ حکیم یوسف حسن، مرتبہ، نیرنگ خیال (اقبال نمبر)، ص: ۳۴۵

۲۵ فقیر سیّد وحید الدین، روز گارِ فقیر، (حصہ اول)، لائن آرٹ پریس، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص:۲۱۳

۲۶ ایضاً، ص: ۲۱۴

خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص:۶۵۹ [۲۷]

۲۸ سیّد نظیر نیازی، مترجم، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص: الف

۲۹ حکیم یوسف حسن، مرتبہ، نیرنگ خیال (اقبال نمبر)، ص: ۳۴۵

۳۰ سید محی الدین قادری، ڈاکٹر. مرتبہ، شاد اقبال، حیدر آباد دکن: مطبوعہ اعظم سٹیم پریس، ۱۹۴۲ء، ص: ۴۵

۳۱ علامہ محمد اقبال، ڈاکٹر، فلسفہ عجم، حیدرآباد (دکن): مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ۱۹۴۴ء، ص: ۹

۳۲ ایضاً، ص: ۹، ۱۰

۳۳ فقیر سید وحید الدین، روز گار فقیر، نئی دہلی: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۲ء، ص: ۲، ۳

۳۴ بشیر احمد ڈار، انوار اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء، ص: ۴۵

۳۵ سید نذیر نیازی، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور: بزم اقبال ۱۹۵۸ء، ص: الف

۳۶ سید محی الدّین قادری زور، ڈاکٹر، شاد اقبال، حیدر آباد، مبوعہ اعظم گڑھ سٹیم پریس، ۱۹۴۲ء، ص:

۳۷ رفیع الدین ہاشمی، مرتبہ، خطوط اقبال، نئی دہلی، اقبال صدی پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ص: ۲۲، ۲۳، ۲۴